مذاکرۂ علمیہ

مسئلہ جبر و قدر

(۳)

نظریہ کی حدتک یہ بات معقول ہے لیکن عملی دقت یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں جس سے ہم انسان کے کردار میں فطرت اصلیہ، خارجی احوال اور غیر مقدّر اختیار کے حصے الگ الگ متعین کر سکیں، اور اپنے اخلاقی احکام کو صرف تیسرے حصے کی حد تک محدود رکھیں اگر اخلاقی قدر و قیمت کا انحصار صرف اسی عنصر کی مقدار پر ہو تو ہمارے لئے کسی شخص کے متعلق نیک یا بد ہونے کا حکم لگانا قطعاً ناممکن ہے کسی آلہ سے ناپ کر، کسی ترازو سے تول کر، کسی طریق تحلیل سے تجزیہ کر کے ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ ایک نیک آدمی کس حد تک پیدائشی نیک ہے کس حدتک احوال کا بنایا ہوا نیک ہے، اور کس حدتک اپنے غیر مقدر اختیار کی بنا پر نیک ہے اور ایک برا آدمی کہاں تک مجبوراً برا ہے، اور کہاں تک بالارادہ و بالاختیار برا۔ پس قدریت کے اس نظریہ کو تسلیم کرنے سے ہمارے تمام اخلاقی احکام معطل ہو جاتے ہیں۔ اور صرف اخلاقی احکام ہی نہیں، بلکہ اس کے بعد تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے تعزیری قوانین منسوخ کر دیں، اپنی عدالتوں کو برخاست کر دیں اور جیل خانوں کو توڑ دیں کیونکہ جن مجرموں کو ہم پکڑتے ہیں، اور جن پر ہمارے جج سزا کے فیصلے صادر کرتے ہیں، اور جن کو ہم جیلخانوں میں ٹھونس دیتے ہیں، ان کے متعلق ہمارے بڑے سے بڑے فاضل جج کو بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے جرم میں ان کے اپنے غیر مقدر اختیار کا کس حدتک دخل ہوتا ہے اور جب یہ بنیادی چیز غیر معلوم ہے تو کسی طرح ممکن نہیں کہ سزا کی مقدار مجرم کے اختیار کی مقدار کے مطابق ہو۔

اس مرحلہ پر قدریت ایک ایسی سرزمین میں پہنچ جاتی ہے جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ وہ راستہ کو ٹٹول ٹٹول کر چلنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کرے، مگر چند قدم بھی ٹھوکروں اور لغزشوں سے بچ کر نہیں چل سکتی۔ آخر وہ پلٹ کر جبریت سے کہتی ہے کہ اگر میرے نظریہ سے اخلاقی احکام معطل ہو جاتے ہیں، اور عدالت کا نظام نہیں چل سکتا، تو تیرے نظریہ سے بھی حاصل ہوتا ہے بلکہ اس سے زیادہ برا نتیجہ تیرے نظریہ سے بھی حاصل ہوتا ہے تیرے نظریہ کی رو سے تو انسان اپنے کسی فعل کا ذمہ دار ہی نہیں ہے۔ پھر حسن و قبح کے احکام کس بنا پر؟ مدح و ذم کس چیز کی؟ سزا و تعزیر کے فیصلے کس وجہ سے؟ ایک غیر ذمہ دار آدمی کا نیک یا بد ہونا تو ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کا مریض یا تندرست ہونا۔ پھر جب ایک شخص کو اس بنا پر سزا نہیں دی جاتی کہ اسے بخار کیوں ہے، تو ایک دوسرے شخص کو اس بنا پر کیوں سزا دی جائے کہ اس نے چوری کیوں کی؟

اس سوال کا جبریت کے پاس بھی کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات وہ کہہ سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر عمل اپنے کچھ قدرتی نتائج رکھتا ہے جس طرح بیماری کا طبعی نتیجہ تکلیف ہے اور تندرستی کا طبعی نتیجہ لذت و راحت اسی طرح نیک چلنی کا طبعی نتیجہ مدح اور انعام ہے۔ اور بد چلنی کا طبعی نتیجہ ذم اور سزا۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ کا جل جانا ضروری ہے۔ اسی طرح جرم کرنے سے کسی نہ کسی طرح کی سزا پانا بھی ضروری ہے خواہ آدمی پر اس فعل کی کچھ ذمہ داری نہ ہو لیکن یہ جواب صرف اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم انسان کو ایک عقلی و نفسی وجود کے بجائے محض ایک مادی وجود تسلیم کر لیں، اور یہ مان لیں کہ انسان میں عقل، نفس، روح کوئی چیز نہیں ہے صرف طبیعت ہے جو ایک لگے بندھے قانون کے مطابق کام کئے جا رہی ہے اور انسان اسی طرح اس کے زیر اثر ہے جس طرح درخت، دریا، پہاڑ، اور دوسری موجودات ہیں۔ مگر انسانی زندگی کے مظاہر کی یہ میکانکی تعلیل کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ اس کے براہین (جن پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے) نہایت کمزور ہیں۔ اور اس کے تسلیم کر لینے کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ قانون اخلاق مذہب سب بے قدر و قیمت ہو جائیں اور خود انسان بحیثیت انسان ہونے کے دوسری موجودات کے مقابلہ میں کسی شرف عقلی و نفسی کا حامل نہ رہے۔

اخلاقیات کی ناکامی اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ علم الاخلاق، جبریت اور قدریت کے درمیان فیصلہ کرنے میں ناکام رہا ہے، اور خالص اخلاقی دلائل وشواہد سے ہم کو قطعی طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انسانی سیرت وکردار کے متعلق جبری نظریہ درست ہے یا قدری نظریہ؟ جتنے قوی دلائل انسان کو ذمہ دار اور فاعل مختار قرار دینے کے حق میں ہیں۔ قریب قریب اتنے ہی زبردست دلائل اس کو غیر ذمہ دار اور قطعاً بے اختیار قرار دینے کے حق میں بھی ہیں۔

اب اس مسئلہ کا آخری پہلو باقی رہ گیا ہے، اور وہ دینی پہلو ہے۔

دینی نقطۂ نظر دینیات میں یہ مسئلہ قریب قریب اسی حیثیت سے آتا ہے جس حیثیت سے فلسفہ میں اس پر بحث کی گئی ہے، مگر یہاں مشکلات اس سے بہت زیادہ ہیں فلسفہ کی نظر تو صرف امور ماورائے طبیعت پر ہے، اور انسان کی عملی زندگی سے اس کو وہ تعلق نہیں ہے جو حکمت علمی یا اخلاقیات کو ہے مگر دینیات نے کسی نہ کسی طرح سے حکمت علمی اور امور ماورائے طبیعت دونوں پر نظر کی ہے، اور اپنی تعلیمات میں دونوں کو جمع کیا ہے۔ ایک طرف تو ادیان نے انسان کو اوامر ونواہی کا مخاطب ٹھیرایا ہے، اور طاعت پر جزا اور عصیان پر سزا کے مترتب ہونے کا قانون پیش کیا ہے جس کے لئے انسان کا اپنے اعمال میں ذمہ دار اور کسی نہ کسی حد تک مختار ہونا ضروری ہے۔ اور دوسری طرف وہ ایک ایسی بالاتر ہستی یا ایک ایسے بالاتر قانون کا تصور بھی پیش کرتے ہیں۔ جو انسان سمیت تمام کائنات کو محیط ہے، اور جس کی گرفت میں سارا عالم کون وفساد جکڑا ہوا ہے پس دینیات میں یہ مسئلہ، فلسفہ طبیعیات، اور اخلاقیات، تینوں سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ یہ تینوں تو معاملہ کے محض کسی ایک پہلو کا اثبات کرتے ہیں اور دوسرے پہلو کو اس کے موافق کرنے کی خاطر توڑنے مروڑنے کے لئے آزاد ہیں لیکن مذہب بیک وقت دونوں کا اثبات کرتا ہے اور وہ اپنے اس طریقہ کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کے لئے مجبور ہے کہ ان دونوں متعارض باتوں میں موافقت کی کوئی متوسط صورت نکالے۔

یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے کہ دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس مشکل کو حل کرنے کی کیا صورت

اختیار کی ہے کیونکہ مجھ سے سوال صرف اسلام کے متعلق کیا گیا ہے، اور اختصار کی خاطر بھی یہ ضروری ہے کہ میں اپنی بحث کو صرف اسی کی حد تک محدود رکھوں۔

صحیح اسلامی مسلک جن مسائل کا تعلق امور ما ورا طبیعت سے ہے۔ ان کے بارے میں اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہے کہ جس چیز کا جاننا اور جس حد تک جاننا ضروری تھا وہ اللہ اور اس کے رسول نے بتا دی ہے اس سے زیادہ کا کھوج لگانا، اور ایسی باتوں میں خوض کرنا جن کے متعلق یقینی معلومات حاصل کرنے، یا جن کی کنہ کو سمجھنے کے ذرائع ہمارے پاس نہیں ہیں، اور جن کے جاننے سے ہم کو کسی قسم کا نقصان بھی نہیں ہے، لاحاصل بھی ہے، اور خطرناک بھی۔ اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کرو جن کو اگر تم پر ظاہر کیا جائے تو تم کو برا معلوم ہو۔ ۵: ۱۴) اور اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (جو کچھ رسول نے تم کو دے دیا ہے وہ لے لو اور جس سے منع کیا ہے اس سے باز آ جاؤ ۵۹: ۱) اور اسی لئے احادیث نبوی میں کثرت سوال اور فضول باتوں میں تکلف کرنے کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِنَّ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَالَا يَعْنِيْهِ[۱] (آدمی) کے اسلام کی بہتری اس میں ہے کہ وہ بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے)۔

یہ تقدیر کا مسئلہ بھی من جملہ انہی مسائل کے ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید فرمائی ہے کہ اس مسئلہ میں بحث کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ ایک مرتبہ صحابہ آپس میں اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے۔ اتنے میں آنحضرت تشریف لے آئے اور یہ باتیں سن کر آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کیا انہی باتوں کا تم کو حکم دیا گیا ہے؟ کیا اسی لئے میں تم میں بھیجا گیا ہوں؟ ایسی ہی باتوں سے پچھلی قومیں ہلاک ہوئی ہیں میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم اس بات میں جھگڑا نہ کرو[۲]۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا جو شخص

[۱] یہ حدیث امام زہری نے امام زین العابدینؓ کے واسطہ سے روایت کی ہے۔ (ترمذی) [۲] یہ حدیث مختلف طریقوں سے حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ حضرت انسؓ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔ (دیکھو ترمذی و ابن ماجہ)

تقدیر کے بارے میں گفتگو کرے گا اس سے تو قیامت کے دن سوال کیا جائے گا۔ مگر جو خاموش رہے گا اس سے کچھ سوال نہ ہوگا[1] مطلب یہ کہ یہ مسئلہ ان معاملات میں سے تو ہے نہیں کہ شرعاً تم پر ان کے بارے میں کلام کرنا ضروری ہو۔ لہٰذا اگر تم اس پر کوئی گفتگو نہ کرو تو قیامت میں تم سے کوئی سوال نہ ہوگا لیکن اگر تم نے کلام کیا تو لامحالہ یا وہ غلط ہوگا یا صحیح۔ اور غلط ہونے کی صورت میں تم ایک ایسی بات میں پکڑے جاؤ گے جس سے بحث کرنے کی تم کو کوئی ضرورت نہ تھی پس بولنے میں نقصان کا احتمال ہے۔ اور نہ بولنے میں کوئی نقصان نہیں ایک اور موقع پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم رات کے وقت حضرت علی اور حضرت فاطمہ علیہما السلام کے مکان پر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ تم لوگ نماز تہجد کیوں نہیں پڑھتے؟ حضرت علی نے جواب دیا کہ "یا رسول اللہ ہمارے نفس اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ چاہے گا کہ ہم اٹھیں تو اٹھ جائیں گے۔ یہ سن کر حضور فوراً واپس ہوگئے اور ران پر ہاتھ مار کر فرمایا۔ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے)[2]

یہی وجہ ہے کہ محدثین اور فقہاء کے گروہ نے صرف وَالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ کے مجمل اعتقاد پر اکتفا کیا ہے۔ اور وہ اس بات میں زیادہ کھوج لگانے والوں اور جبر یا قدر کا قطعی حکم لگانے والوں کی سخت مذمت کرتے رہے ہیں لیکن رسول اکرم اور بزرگان سلف کی ممانعت کے باوجود دوسری قوموں کے مسائل فلسفہ و طبیعیات کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے یہ مسئلہ مسلمانوں میں بھی پیدا ہوا اور اس کثرت سے اس پر بحث کی گئی کہ آخر کار یہ اسلامی علم کلام کے مہمات مسائل میں داخل ہوگیا۔

متکلمین اسلام کے مذاہب

متکلمین اسلام کے اس کے اس بارے میں دو مشہور مذہب ہیں جو قدریہ اور جبریہ کہلاتے ہیں۔ یہاں ان کی تمام بحثوں کو نقل کرنا تو بہت مشکل ہے کہ اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی

---

[1] یہ حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے (ابن ماجہ) [2] اس حدیث کو زہری نے امام زین العابدین سے اور انہوں نے امام حسین ابن علی علیہم السلام سے روایت کیا ہے (بخاری و نسائی) محدثین نے آنحضرت کے واپس پلٹ جانے اور یہ آیت پڑھنے کی مختلف توجیہیں کی ہیں مگر ہیں اس کے صاف معنی یہ سمجھتا ہوں کہ عملی زندگی کے مسائل میں تقدیر کے مسئلہ سے استدلال کرنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پسند نہیں فرماتے تھے۔

دست درکار ہے تاہم میں ان کے مقالات کا ایک واضح خلاصہ یہاں پیش کروں گا

مذہب قدر معتزلہ اور بعض دوسرے فرقوں کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا، اس کو افعال پر قدرت بخشی، اور نیکی و بدی کا اختیار اسی کو تفویض کر دیا۔ اب وہ خود اپنی قدرت کے مطابق اور اپنی مشیت کے موافق استقلال کے ساتھ اچھے اور برے افعال کرتا ہے۔ اور اپنے اسی اختیار کی بنا پر دنیا میں مدح و ذم اور آخرت میں ثواب و عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے نہ اس کو کفر و معصیت پر مجبور کیا گیا ہے، اور نہ ایمان و طاعت پر۔ بلکہ وہ اپنے رسولوں کو بھیجتا ہے۔ کتابیں نازل کرتا ہے۔ نیکی کا حکم اور بدی سے منع فرماتا ہے صحیح اور غلط، حق اور باطل کو واضح طور پر ممیز کرتا ہے۔ اور ان کو خبردار کر دیتا ہے کہ اگر سیدھا راستہ اختیار کرو گے تو نجات پاؤ گے اور غلط راستہ پر چلو گے تو اس کا برا نتیجہ دیکھو گے۔

اس مذہب کے قواعد سب سے پہلے واصل بن عطاء الغزال نے مقرر کیے تھے جس کا قول تھا کہ باری تعالیٰ الحکیم عادل ہے، اس کی طرف شر اور ظلم کی اضافت جائز نہیں ہے، اور نہ یہ جائز ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو جن اوامر و نواہی سے مکلف کیا ہے، ان کے خلاف اعمال کے صدور کا ارادہ کرے، اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ بندوں کو کسی ایسے فعل پر سزا دے جس کا ارتکاب انہوں نے خود اس کے حکم سے کیا ہو۔ لہٰذا بندہ ہی فاعل خیر و شر ہے، وہی ایمان و کفر اور طاعت و معصیت اختیار کرتا ہے۔ اور اللہ نے ان سب کاموں کی قدرت اس کو عطا کر دی ہے۔ ابراہیم بن سیار النظام نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ خدا صرف خیر پر قدرت رکھتا ہے۔ شرور و معاصی اس کی قدرت سے خارج ہیں۔ معمر بن عباد السلمی اور ہشام بن عمرو الفوطی نے اس میں اور زیادہ شدت اختیار کی اور القدر خیرہ و شرہ من اللہ کا اعتقاد رکھنے والے کو کافر اور گمراہ ٹھیرایا کیونکہ یہ اعتقاد ان کے نزدیک باری تعالیٰ کی تنزیہ کے خلاف ہے، اور اس کی رو سے حق تعالیٰ ظالم ٹھیرتا ہے۔ ان کے بعد جاحظ، خیاط، کعبی، جبائی، قاضی عبدالجبار وغیرہ جتنے بڑے بڑے معتزلہ گذرے ہیں سب نے پورے زور کے ساتھ یہ حکم لگایا ہے کہ خدا اپنے بندوں کے افعال کا خالق نہیں ہے بلکہ خود بندے

ان کے خالق ہیں، اور یہ کہ خدا کے لئے تکلیف مالایطاق جائز نہیں ہے۔

قرآن مجید سے قدریہ کا استدلال اس مذہب کی تائید میں معتزلہ نے قرآن مجید کی بہت سی آیات سے استدلال کیا ہے۔ مثلاً

وہ آیات جن میں بندوں کے افعال خود بندوں کی طرف منسوب کئے گئے ہیں جیسے كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ (۲:۳) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۲:۹) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۸:۷)، مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ۔ (۴:۱۸) كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ[1] (۵۲:۱)

وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ انسان کے اپنے اعمال پر جزا و سزا مترتب ہوگی۔ جیسے۔ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ (۴:۲) اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۵:۴)۔ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۷:۷)۔

وہ آیات جن میں شر اور ظلم اور مذمومات سے باری تعالیٰ کے فعل کو منزہ قرار دیا گیا ہے جیسے۔ اَلَّذِىْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَىْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲:۱) اور ظاہر ہے کہ کفر اچھی چیز نہیں ہے۔ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (۱۵:۶) اور مسلم ہے کہ کفر حق نہیں ہے۔ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۴۱:۶) وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳:۱۱)۔

وہ آیت جن میں کافروں اور گنہگاروں کو ان کے برے افعال پر ملامت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کو ایمان و طاعت سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ جیسے وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا

---

[1] اطناب سے بچنے کے لئے آیات کا ترجمہ نہیں دیا گیا ہے تاہم سورۃ اور رکوع کا نمبر دیدیا گیا ہے۔ جو اصحاب چاہیں حوالے کے مطابق آیات نکال کر کسی مترجم قرآن مجید میں ترجمہ ملاحظ فرماسکتے ہیں۔

اِذْ جَاءَهُمُ الْهُدٰی (۷: ۱۱) مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ (۳۸: ۵) فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔
(۸۴: ۱) لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۳: ۱۰) اگر فی الواقع خدا نے ان لوگوں کو ایمان لانے
سے روکا ہوتا اور انہیں کفر و معصیت پر مجبور کیا ہوتا تو ان سے اس قسم کے سوالات کرنے جائز نہ ہوتے ۔
اگر کوئی شخص کسی کو حجرے میں بند کر دے اور کہے کہ تو کیوں نہیں نکلتا تو یہ ایک غیر معقول سوال ہوگا۔ پھر خدا
کی طرف یہ بات کیسے منسوب کی جا سکتی ہے۔ کہ ایک طرف تو ان کو حق سے پھیر دے اور پھر کہے کہ تم کہاں پھرے
چلے جا رہے ہو؟ (اَنّٰی تُصْرَفُوْنَ) خود ان کو بھٹکائے اور پوچھے کہ تم کدھر بھٹکے جا رہے ہو۔؟ (اَنّٰی يُؤْفَكُوْنَ
ان میں کفر خلق کرے اور پھر پوچھے کہ تم کیوں کفر کرتے ہو؟ (لِمَ تَكْفُرُوْنَ انہیں حق کو باطل سے چھپانے
پر مجبور کرے اور پھر کہے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ (لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ)۔

۲ وہ آیات جن میں ایمان اور کفر کو بندوں کی مشیت سے متعلق کیا گیا ہے جیسے فَمَنْ شَآءَ
فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸: ۴) فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۷۳: ۱)
یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنے کفر و معصیت کو مشیت الٰہی کی طرف منسوب کرتے ہیں جیسے
سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اَشْرَكْنَا (۶: ۱۸) وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا
لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ (۱۶: ۵)۔

وہ آیات جن میں بندوں کو حسن عمل کی طرف دعوت دی گئی ہے مثلاً وَسَارِعُوْا اِلٰى
مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۳: ۱۴) اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ (۴۶: ۴) وَاَنِيْبُوْا اِلٰى رَبِّكُمْ (۳۹: ۶)
ظاہر ہے کہ طاعت کا حکم دینا اور اس کی طرف دوڑنے اور لپکنے کی تاکید کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، جب تک
کہ مامور میں اس کی قدرت نہ ہو۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی اپاہج سے کہا جائے کہ اٹھ اور دوڑ

وہ آیات جن میں بیان کیا گیا ہے کہ بندے ایسے افعال کرتے ہیں۔ جن کا خدا نے ان کو حکم نہیں دیا
ہے جیسے ۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ

(۴:۹) إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (۷: ۳)۔ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ (۳۹:۱)۔
وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ (۹۸)

وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ لوگ اپنے کیے کی سزا بھگتتے ہیں۔ جیسے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (۳۰: ۵) وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (۴۲: ۴) إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلٰكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۱۰: ۵) وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰى إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ (۲۸: ۶)۔

وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہدایت اور گمراہی پر مجبور نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنے اختیار سے کوئی ایک راستہ منتخب کرتا ہے مثلاً۔ وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (۴۱: ۲) فَمَنِ اهْتَدٰى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ۔ (۱۰: ۱۰)۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (۲: ۳۴)

وہ آیات جن میں انبیا نے اپنے قصوروں کا اعتراف کیا ہے اور ان کو خود اپنی طرف منسوب کیا ہے، مثلاً حضرت آدم کہتے ہیں۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا (۷: ۲) حضرت یونس کہتے ہیں۔ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (۲۱: ۶) حضرت موسیٰ کہتے ہیں رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي (۲۸: ۲) حضرت نوح کہتے ہیں رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ (۱۱: ۴)

(باقی)